رسائل و مسائل

مغربی نیشنلزم اور فرنگی لباس

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کا اسم گرامی ہمارے ملی اور سیاسی پلیٹ فارم پر کافی شہرت رکھتا ہے۔ مستقل پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تو ہمیں ان سے بہترین رہنمائی کی توقعات تھیں، کیونکہ علماء کے گروہ میں سے شائد وہ پہلے شخص ہیں جن کو اس قدر دنیا دیکھنے اور جدید زمانہ کے حالات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے۔ ہم توقع رکھتے تھے کہ علم دین کے ساتھ یہ تجربہ اور واقفیت مل کر کوئی بہتر نتیجہ پیدا کریگی۔ لیکن ساحل ہند پر قدم رکھتے ہی انہوں نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیے بغیر جو بیانات دینے شروع کیے ان سے ہماری توقعات مایوسی سے بدلنے لگیں یہاں تک کہ جمعیت علمائے بنگال کا خطبۂ صدارت دیکھ کر تو مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ ۷ ارجون کے مدینہ میں ان کا پورا خطبہ شائع ہوا ہے۔ ذیل میں ان کے چند فقرے نقل کرتا ہوں۔ براہ کرم آپ ہمیں بتائیے کہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان خیالات کو قبول کر سکتے ہیں:

(۱) "اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا چلا جا رہا ہے تو اسے یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیے۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اُسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں

اٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں۔"

(۲) "میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر مذہب و ملت برٹش گورنمنٹ کے دو صد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپ سے تنفر برت کر اپنی ترقی کو محدود کر لیا ہے اسے اب خیر باد کہیں۔ اس معاملہ میں میں نے ترکی قوم کے اس انقلاب کا پوری طرح مطالعہ کیا ہے جو سلطان محمود سے شروع ہو کر مصطفےٰ کمال کی جمہوریت پر ختم ہوتا ہے۔ ..... میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز ممبر مانا جائے۔ اسکے لیے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت محسوس ہوگی۔"

اس "معاشرتی انقلاب" کی تشریح آگے چل کر مولانا نے اپنے اس انقلابی پروگرام میں کی ہے جو انہوں نے صوبہ سندھ کے لیے تجویز کیا ہے۔ چنانچہ اس میں فرماتے ہیں:

"سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا مگر وہ کوٹ و پتلون کی شکل میں ہوگا یا کالر دار قمیص اور نکر کی صورت میں۔ مسلمان اپنا نکر گھٹنے سے نیچے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کیا جائیگا۔ جب مسلمان مسجد میں آئیگا ہیٹ اتار کر ننگے سر نماز پڑھے گا۔"

اس نوعیت کے خیالات مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں کی طرف سے تو ہمیشہ پیش ہوتے رہے ہیں، لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ علما کے طبقہ کا ایک ممتاز فرد، جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کا جانشین اور منجملۂ اکابر دیوبند ہے، ان خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی نیشنلزم اور مغربی لباس اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے مذہباً جائز ہے؟"

ترجمان القرآن - مولانا سندھی ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ عالم دین ہیں۔ انہوں نے جو قربانیاں اپنے

اصول اور اپنے مشن کی خاطر سالہا سال تک کی ہیں وہ ان کے خلوص کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تر ثابت کرتی ہیں۔ لہٰذا اگر اُن جیسا ایک مخلص اور جہاندیدہ عالم ہمارے سامنے بعض اجتماعی مسائل پر اپنے کچھ نظریات —— جو ظاہر ہے کہ اس کے طویل تجربات اور برسوں کے غور و فکر پر مبنی ہیں —— پیش کرتا ہے، تو ہمارے لیے مناسب تر بات یہ ہے کہ اپنے ذہن کو شکوہ و شکایت یا شبہات میں الجھانے کے بجائے اس کے نظریات کو علمی حیثیت سے جانچ کر دیکھیں، اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر تنقید کریں۔ ایک ذی علم اور فہیم آدمی جو نیک نیت بھی ہو، اس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جب اسکی غلطی اس پر واضح ہو جائیگی تو وہ اس سے رجوع کر لیگا۔ اور بالفرض اگر وہ اپنی غلطی کا معترف نہ بھی ہو، تب بھی اس کے غلط نظریہ کو زمین میں جڑ پکڑنے سے صرف سنجیدہ علمی تنقید ہی روک سکتی ہے۔ شکوہ و شکایت اور طنز و تعریض سے اس کا سدّباب نہیں کیا جا سکتا۔

نیشنلزم بربنائے مصلحت یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینے کا مشورہ مولانا نے جن وجوہ و دلائل کی بنا پر دیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہیں:

(۱) "اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور چھاتا چلا جا رہا ہے تو"...... اسے ایسا کرنا چاہیے۔

(۲) "پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اسے دنیا جانتی ہے، مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں"...... اور وقار اُسی طرح قائم ہو سکتا ہے جس طرح آج کل کی مغربی قوموں نے قائم کیا ہے۔

(۳) "ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے اور عہد جدید جسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے، دونوں مذہبی اسکول ہیں۔ لیکن آج کل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعی نابلد ہے۔ اس کا مدار فقط سائنس اور فلسفہ پر ہے۔ اسلیے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کو سمجھنے (؟)

کی استعداد پیدا نہ ہوئی تو سر بسر نقصان ہی نقصان ہمارے حصہ میں آئیگا"۔ ۔ ۔ ۔ سمجھنے سے مراد غالباً صرف سمجھنا نہیں بلکہ سمجھ کر اختیار بھی کر لینا ہے کیونکہ مولانا کے سابق مقدمات اسی نتیجہ کی طرف لے جاتے ہیں۔

ان تینوں وجوہ پر غور کیجیے۔ ایک چیز کو اختیار کرنے کا مشورہ اس بنا پر نہیں دیا جا رہا ہے کہ وہ حق اور صدق ہے یا اخلاقاً بجا و درست ہے، بلکہ محض مصلحت اور ضرورت (Expediency) کی بنا پر دیا جا رہا ہے۔ اسکے بعد ایک مسلمان کی نگاہ میں بلکہ کسی با اصول شخص کی نگاہ میں بھی مولانا کے مشورہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ کسی مسلک یا کسی اصول کو اس دلیل سے قبول کرنا کہ فلاں نقصان سے بچنا ہے، اور فلاں فائدہ حاصل کرنا ہے، اور فلاں چیز اب دنیا میں نہیں چل رہی ہے بلکہ اسکی جگہ یہ چیز چل پڑی ہے، کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو خود اپنا کوئی عقلی اور اخلاقی نظریہ رکھتا ہو اور اپنے ضمیر کے تقاضے سے اپنے آپ کو اس کے پھیلانے اور قائم کرنے پر مامور سمجھتا ہو۔ یہ تو نری مصلحت پرستی اور ابن الوقتی (Opportunism) ہے۔ اس کو عقلیت اور اخلاقیت سے کیا واسطہ؟ عقلیت اور اخلاقیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تحقیق سے جس اصول کو ہم نے حق پایا ہے اور اخلاقاً جس کے برحق ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں اس پر سختی کے ساتھ قائم رہیں۔ اگر دنیا میں اس کے خلاف کوئی غلط اصول چل پڑا ہے تو ہمارا کام دنیا کے پیچھے دوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا کو کھینچ کر اپنے اصول کی طرف لانا ہے۔ اپنے اعتقاد میں ہماری راستی کا امتحان اسی میں ہے کہ دنیا کے پیچھے نہ چلنے سے جو نقصان ہمیں پہنچتا ہو اسے صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کریں۔ اگر دنیا ہماری وقعت اس لیے نہیں کرتی کہ ہم اسکے پیچھے نہیں چلتے تو ایسی دنیا کو ہمیں ٹھوکر پر مارنا چاہیے۔ وقار ہمارا معبود نہیں ہے کہ اس کی خوشامد کرتے ہوئے ہم ہر اس راستے پر دوڑتے پھریں جس پر اُس کی جھلک نظر آئے۔ اگر اُس حق کا زمانہ گذر گیا ہے جو ہمارے اعتقاد میں حق ہے تو ہم میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ زمانہ کا کان

پکڑ کر اسے پھر سے حق کی طرف کھینچ لائیں۔ یہ سوچنا پست ہمت شکست خوردہ لوگوں کا کام ہے کہ اب زمانہ میں فلاں چیز کا چلن ہے تو چلو، اس کو سمجھیں اور سمجھتے سمجھتے حلق سے نیچے بھی اتار لیں۔

اس باب میں مسلمان کو اُتنی استقامت تو دکھانی چاہیے جتنی مارکس کے پیروؤں نے جنگِ عظیم کے موقع پر دکھائی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تھی تو سیکنڈ انٹرنیشنل کے ارکان میں اِسی نیشنلزم کے سوال پر زبردست اختلاف برپا ہوا تھا۔ بہت سے وہ سوشلسٹ جو اشتراکیوں کے بین الاقوامی محاذ پر مجتمع تھے، اپنی اپنی قوموں کو میدانِ جنگ میں کودتے دیکھ کر قوم پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو گئے، اور انھوں نے جنگ میں اپنی قوم کا ساتھ دینا چاہا۔ مگر مارکس کے پیروؤں نے کہا کہ ہم ایک ایسے اصول کے لیے جنگ کرنے اٹھے ہیں جس کے لحاظ سے تمام قوموں کے سرمایہ دار ہمارے دشمن، اور تمام قوموں کے مزدور ہمارے دوست ہیں۔ پھر ہم کس طرح اس نیشنلزم کو قبول کر سکتے ہیں جو مزدوروں کو تقسیم کرتا ہے اور انہیں سرمایہ دار کے ساتھ ملا کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں لڑاتا ہے۔ اس بنا پر مارکسیوں نے اپنے سالہا سال کے پرانے رفیقوں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ انہوں نے سیکنڈ انٹرنیشنل کا ٹوٹ جانا گوارا کر لیا مگر اپنے اصول سے دست بردار ہونا گوارا نہ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو سچے کمیونسٹ تھے انہوں نے عملاً خود اپنے ہاتھوں سے قوم پرستی کے بت کو توڑا۔ جرمن کمیونسٹ نے اپنے اصول کی خاطر جرمنی کے خلاف، اور روسی کمیونسٹ نے اپنے اعتقاد کی خاطر روس کے خلاف، اور اسی طرح ہر ملک کے کمیونسٹ نے اپنے مسلک کی خاطر اپنے ملک کی حکومت کے خلاف کام کیا۔

جس طرح کمیونسٹ اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ پھر وہ کیوں اتنا دنی اور پست ہو جائے کہ کسی نقصان سے بچنے یا کسی کی نگاہ میں وقار

حاصل کرنے کے لیے اپنے مقام سے ہٹ جائے، اور اگر وہ اپنے مقام سے ہٹتا ہے تو اس میں کم از کم اس بات کا تو شعور ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز سے ہٹ رہا ہے اور کس چیز کی طرف جا رہا ہے کیونکہ اپنی جگہ چھوڑنا تو محض کمزوری ہے، مگر ایک جگہ سے ہٹ جانے کے باوجود اپنے آپ کو اسی جگہ سمجھنا کمزوری کے ساتھ بے شعوری بھی ہے۔ میں "مسلمان" صرف اس وقت تک ہوں جب تک میں زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور کسی دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میرے حق میں یہ سراسر بے شعوری ہوگی اگر میں یہی سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ" یا "جینی قصائی" یا "اشتراکی مہاجن" یا "موحد بت پرست"۔

نیشنلزم اور اسلام سرسری نظر میں جو شخص نیشنلزم کے معنی اور اسکی حقیقت پر غور کرے گا اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اسلام اور نیشنلزم، دونوں اپنی اسپرٹ اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام کا خطاب انسان من حیث الانسان سے ہے۔ وہ سارے انسانوں کے لیے ایک اعتقادی و اخلاقی اساس پر عدل اور تقوٰی کا ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اور سب کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر جو اس نظام کو قبول کرلے اسے مساویانہ حقوق کے ساتھ اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ اسکی عبادات میں، اسکی معیشت میں، اسکی سیاست میں، اسکی معاشرت میں، اس کے قانونی حقوق اور فرائض میں، غرض اسکی کسی چیز میں بھی اُن لوگوں کے درمیان کسی قسم کی قومی یا نسلی یا جغرافی یا طبقاتی تفریقات کی گنجائش نہیں جو اسلام کے مسلک کی پیروی اختیار کرلیں۔ اس کا منتہائے نظر ایک ایسی جہانی ریاست (World state) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصہ دار

بنایا جائے اور مخالفانہ مقابلہ کی جگہ دوستانہ تعاون پیدا کیا جائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی مادّی خوشحالی اور روحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ اسلام انسانی فلاح کے لیے جو اصول اور جو نظام حیات پیش کرتا ہے، وہ عام انسانوں کو اپیل ہی اُس وقت کر سکیگا جب کہ ان کے اندر جاہلیت کے تعصبات نہ ہوں، اور وہ اپنی قومی روایات کی وابستگی سے، نسلی تفاخر کے جذبات سے، خونی اور خاکی رشتوں کی محبت سے پاک ہو کر محض انسان ہونے کی حیثیت سے یہ جانچنے کے لیے تیار ہوں کہ حق کیا ہے، عدل و انصاف اور راستی کس چیز میں ہے، ایک طبقہ یا ایک قوم یا ایک ملک کی نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا راستہ کونسا ہے۔

برعکس اس کے نیشنلزم انسان اور انسان کے درمیان اسکی قومیت کے لحاظ سے تمیز کرتا ہے۔ نیشنلزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر قوم کا نیشنلسٹ اپنی قومیت کو دوسری تمام قومیتوں پر ترجیح دے۔ اگر وہ جفاکار قوم پرست (Aggressive Nationalist) نہ ہو تب بھی قوم پرستی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ تمدنی، معاشی، سیاسی اور قانونی حیثیت سے "قومی" اور "غیر قومی" میں فرق کرے، اپنی قوم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد محفوظ کرے، قومی مفاد کے لیے معاشی امتیازات کی دیواریں کھڑی کرے، جن تاریخی روایات اور روایتی تعصبات پر اسکی قومیت قائم ہے انکی سختی کے ساتھ حفاظت کرے، اور اپنے اندر قومی تفاخر کے جذبات پرورش کرے۔ وہ دوسری قومیت کے لوگوں کو مساوات کے اصول پر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اپنے ساتھ شریک نہ کریگا۔ جہاں اسکی قوم دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فوائد و منافع سے متمتع ہو رہی ہو یا ہو سکتی ہو، وہاں عدل و انصاف کے لیے اس کا دل اندھا ہو جائیگا۔ اس کا منتہائے نظر جہانی ریاست کے بجائے قومی ریاست (Nation state) ہوگا، اور اگر وہ کوئی جہانی نظریہ اختیار کریگا بھی تو اسکی صورت لازماً امپیریلزم یا قیصریت کی صورت ہوگی، کیونکہ اسکے اسٹیٹ میں دوسری قومیتوں کے لوگ کسی طرح برابر کے حصہ دار کی حیثیت

سے داخل نہیں ہو سکتے، بلکہ صرف "غلام" کی حیثیت ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں مسلکوں کے اصول، مقاصد اور روح کا یہ محض ایک سرسری سا خاکہ ہے جس کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مسلک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں نیشنلزم ہے وہاں اسلام کبھی پھل پھول نہیں سکتا، اور جہاں اسلام ہے وہاں نیشنلزم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ نیشنلزم کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے پھیلنے کا راستہ بند ہو جائے، اور اسلام کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کی ترقی کا حامی ہو سکتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت دونوں کشتیوں میں سوار رہ سکے۔ ایک مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرنا اور پھر ساتھ ہی اسکے بالکل مخالف مسلک کی حمایت و وکالت کرنا صاف طور پر نظر کے الجھاؤ اور ذہن کی پراگندگی کا پتہ دیتا ہے، اور جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے متعلق مجبوراً ہمیں یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ وہ یا تو اسلام کو نہیں سمجھتے یا نیشنلزم کو، یا دونوں سے ناواقف ہیں۔

یورپین نیشنلزم کی حقیقت یہ تو وہ بات تھی جو نیشنلزم کے بالکل ابتدائی مفہوم پر غور کرنے سے نکلتی ہے اب ہمیں ذرا آگے بڑھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ "یورپین نیشنلزم" کیا چیز ہے جس کے اصول پر مولانا سندھی ہندوستان میں نیشنلزم کی ترقی چاہتے ہیں۔

قدیم جاہلیت میں قومیت کا تصور اچھی طرح پختگی کو نہیں پہنچا تھا۔ قوم کی جگہ انسان کے جذبات زیادہ تر نسل یا قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں قوم پرستی کے بجائے نسل پرستی کا زور تھا، اور اس نسلی عصبیت میں بڑے بڑے عالی دماغ فلسفی اور حکیم تک اندھے ہو جاتے تھے۔ ارسطو جیسا بلند پایہ مفکر اپنی کتاب "السیاست" میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ فطرت نے وحشی قوموں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ غلام بن کر رہیں۔[۱] اُس کے نزدیک دولت حاصل کرنے کے فطری

[۱] کتاب اول باب دوم و ششم

اور جائز ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "نوع انسانی کے ایسے طبقات کو غلام بنانے کے لیے جنگ کی جائے جنہیں فطرت نے اسی غرض کے لیے پیدا کیا ہے"۔ یہ نظریہ اور زیادہ بھیانک ہو جاتا ہے جب ہم اسکے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ یونانیوں کے نزدیک وحشی (Barbarians) کے معنی محض "غیر یونانی" کے تھے اور ان کا بنیادی تصور یہ تھا کہ یونانی لوگوں کے اخلاقی اور انسانی حقوق دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔

یہ اس نیشنلزم کا ابتدائی جرثومہ تھا جس نے بعد کو یورپ میں ترقی کی۔ اس جرثومہ کے نشوونما کو جو طاقت ایک مدت تک روکتی رہی وہ مسیحیت کی طاقت تھی۔ ایک نبی کی تعلیم، اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی صورت میں ہو، بہر حال نسل پرستی اور قوم پرستی کی جگہ ایک وسیع انسانی نقطۂ نظر ہی لیے ہوئے ہو سکتی تھی۔ اسکے ساتھ رومن امپائر کے عالمگیر سیاسی نظام نے بھی کم از کم اتنا کام کیا کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں کو ایک مشترک اقتدار کا مطیع و وفادار بنا کر قومی اور نسلی تعصبات کی شدت کو کم کر دیا۔ اسطرح صدیوں تک پوپ کا روحانی اور شہنشاہ کا سیاسی اقتدار، دونوں مل جل کر عالم مسیحی کو ایک رشتے میں باندھے رہے۔ مگر یہ دونوں طاقتیں ظلم و ستم، اور عقلی و علمی ترقی کی مخالفت میں ایک دوسرے کی مددگار تھیں اور دنیوی اقتدار اور مادّی فوائد کی تقسیم میں باہم حریف و معاند تھیں۔ ایک طرف انکی آپس کی کشمکش نے، دوسری طرف ان کی بداعمالیوں اور ظلم و ستم نے اور تیسری طرف جدید علمی بیداری نے سولھویں صدی میں وہ سیاسی اور مذہبی تحریک پیدا کی جسے تحریک اصلاح (ریفارمیشن) کہتے ہیں۔

اس تحریک کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ پوپ اور شہنشاہ کے اُس اقتدار کا خاتمہ ہو گیا جو ترقی اور اصلاح کا دشمن تھا۔ لیکن اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ جو قومیں ایک رشتہ میں بندھی ہوئی تھیں وہ بکھر گئیں۔ ریفارمیشن اُس روحانی رابطہ کا بدل فراہم نہ کر سکا جو مختلف مسیحی اقوام کے درمیان قائم تھا۔ مذہبی اور سیاسی وحدت کا تعلق ٹوٹنے کے بعد جب قومیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں تو انکی جدا جدا خود مختار

قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ ہر قوم کی زبان اور لٹریچر نے الگ الگ ترقی کرنی شروع کی۔ اور ہر قوم کے معاشی مفاد دوسری ہمسایہ قوموں سے مختلف ہوتے گئے۔ اسطرح سیاسی، معاشی اور تہذیبی بنیادوں پر قومیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا جس نے نسلی عصبیت کے قدیم جاہلی تصور کی جگہ لے لی۔ پھر مختلف قوموں میں نزاع، چشمک اور مسابقت (Competition) کا سلسلہ شروع ہوا۔ لڑائیاں ہوئیں۔ ایک قوم نے دوسری قوم کے حقوق پر ڈاکے ڈالے۔ ظلم اور شقاوت کے بدترین مظاہرے کیے گئے جنکی وجہ سے قومیت کے جذبات میں روز بروز تلخی پیدا ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ قومیت کا احساس رفتہ رفتہ ترقی کر کے قوم پرستی (نیشنلزم) میں تبدیل ہو گیا۔

یہ قوم پرستی جسکا نشو و نما اس طور پر یورپ میں ہوا ہے، چونکہ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مسابقت اور تصادم سے پیدا ہوئی ہے، اسلیے اس میں لازماً چار عنصر پائے جاتے ہیں:۔

(۱) قومی افتخار کا جذبہ جو اپنی قومی روایات اور خصوصیات کی محبت کو پرستش کی حد تک بڑھا لے جاتا ہے، اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی قوم کو ہر لحاظ سے بالا و برتر قرار دیتا ہے۔

(۲) قومی حمیت کا جذبہ جو حق اور انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے آدمی کو ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے کو آمادہ کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

(۳) قومی تحفظ کا جذبہ جو قوم کے واقعی اور خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قوم کو ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو مدافعت سے شروع ہو کر حملہ پر ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً معاشی مفاد کی حفاظت کے لیے محصولات درآمد و برآمد کو گھٹانا بڑھانا، غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندیاں عائد کرنا، اپنے حدود میں دوسروں کے لیے کسب معاش اور شہری حقوق کے دروازے بند کرنا، دفاع ملکی کے لیے دوسروں سے بڑھ چڑھ کر فوجی طاقت فراہم کرنا، اور دوسروں کے ملک میں اپنی قوم والوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے دوڑ جانا۔ (۴) قومی استعلاء و استکبار کا جذبہ جو ہر ترقی یافتہ اور طاقتور قوم کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہو، دوسروں کے خرچ پر اپنی خوشحالی بڑھائے اپنے آپکو پسماندہ قوموں میں "تہذیب" پھیلانے کی خدمت پر خود بخود مامور سمجھے، اور دوسرے ممالک کی قدرتی دولت سے استفادہ کرنے کو اپنا پیدائشی حق قرار دے (باقی)